OPEN ACCESS: Al-Aijaz Research Journal of Islamic Studies & Humanities
ISSN (ONLINE): 2707-1219 & ISSN (PRINT): 2707-1200
http://www.arjish.com

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسفار کا جغرافیائی، تاریخی اور زمانی پس منظر

The Geographical, Historical, and Chronological Background of the Journeys of Prophet Musa (PBUH)

Dr. Asma Aziz
Department of Islamic Studies, GCWUF
Email: asmaaziz@gcwuf.edu.pk

Laiba Mumtaz
M.Phil Scholar, Department of Islamic Studies, GCWUF
Email: laiba786skynet@gmail.com

Received on: 10-01-2026 Accepted on: 15-02-2026

Abstract

The study of the journeys of Prophet Moses (peace be upon him) is of particular significance for understanding the events narrated in the Qur'an within their historical, geographical, and chronological context. This article presents a research-based and analytical study of the journeys of Prophet Moses within the broader geographical context of the Ancient Near East, examining important locations such as Egypt, Midian, the Valley of Tuwa, the Red Sea, the Sinai Peninsula, the Wilderness of Tih, Kadesh-Barnea, Edom, Moab, Mount Nebo, the Holy Land, and Majma al-Bahrayn. The study demonstrates that these journeys were not merely geographical movements but reflected various stages of migration, prophethood, preaching, liberation, law, training, and leadership. Drawing upon the Qur'anic narrative, Tafsir al-Tabari, Tafsir Ibn Kathir, Tafsir al-Qurtubi, and modern historical and geographical studies, the research analyzes the historical significance and geographical identification of these locations. The study concludes that examining the journeys of Prophet Moses within their historical and geographical context provides a clearer understanding of the various stages of the religious, social, and national formation of the Children of Israel.

Keywords: Prophet Moses (peace be upon him), Journeys of Moses, Ancient Near East, Historical Geography, Egypt, Midian, Valley of Tuwa, Red Sea, Sinai Peninsula, Wilderness of Tih, Kadesh-Barnea, Edom, Moab, Mount Nebo, Promised Land, Children of Israel, Exodus, Mosaic Law, National Formation.

قدیم مشرق قریب اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسفار

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پوری حیاتِ مبارکہ ایک ایسے وسیع جغرافیائی، تہذیبی اور سیاسی خطے میں بسر ہوئی جسے جدید مؤرخین اور ماہرینِ تاریخی جغرافیہ قدیم مشرقِ قریب (Ancient Near East) کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ اصطلاح تقریباً 3500 قبل مسیح سے 330 قبل مسیح تک کے اس تاریخی خطے کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو انسانی تہذیب کی ابتدائی شہری ریاستوں، عظیم سلطنتوں، منظم سیاسی نظاموں، تحریر، قانون، تجارت اور الہامی مذاہب میں شمار ہوتا رہا۔ 1اسی تاریخی اور تہذیبی اہمیت کے پیشِ نظر جدید مؤرخین نے اسے" انسانی تہذیب کا گہوارہ (Cradle of Civilization) "بھی قرار دیا ہے، کیونکہ قدیم دنیا کی متعدد نمایاں تہذیبوں نے اسی خطے میں نشوونما پائی اور انسانی تاریخ کے مذہبی، سیاسی اور ثقافتی رجحانات کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔2

یہی خطہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سمیت متعدد انبیائے کرام علیہم السلام کی دعوت ورسالت سے وابستہ رہا ہے۔3 حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسفار سے متعلق تقریباً تمام اہم مقامات بھی اسی قدیم مشرقِ قریب کے جغرافیائی دائرے میں واقع تھے، جہاں مصر کی فرعونی حکومت، مدین، وادیِ طویٰ، بحر قلزم، جزیرہ سینا، صحرائے تیہ، قادش برنیع، ادوم، موآب اور ارضِ مقدس باہم قدیم شاہراہوں، سیاسی سرحدوں اور تہذیبی روابط کے ذریعے مربوط تھے۔ یہی بنی اسرائیل کی آزادی، ان کی قومی تشکیل، شریعتِ موسوی کے عملی نفاذ اور ایک مستقل مذہبی و تہذیبی تشخص کے قیام کے لیے بنیادی پس منظر فراہم کرتا ہے۔

جدید آثارِ قدیمہ کے ماہر William G. Dever کے مطابق Ancient Near East دراصل ایک " Civilizational Corridor"(تہذیبی راہداری) تھا، جہاں افریقہ، ایشیا اور یورپ کے درمیان تجارتی، تہذیبی اور سیاسی روابط مسلسل قائم رہے۔4 اسی طرح Amélie Kuhrt کے نزدیک یہ صرف ایک جغرافیائی اصطلاح نہیں بلکہ ایک تہذیبی اکائی (Civilizational Unit) ہے، جہاں مختلف اقوام، زبانیں، مذاہب اور سلطنتیں باہمی تعامل کے ذریعے ایک مشترکہ تاریخی وثقافتی روایت تشکیل دیتی ہیں5

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسفار کی جغرافیائی وسعت اور مسافت

آپؑ کے اسفار قدیم مشرقِ قریب ((Ancient Near East کے ایک وسیع جغرافیائی خطے تک پھیلے ہوئے تھے، جس میں مصر، مدین، بحر قلزم، جزیرہ نمائے سینا، صحرائے تیہ، قادش برنیع، ادوم، موآب، جبلِ نبو اور بالآخر ارضِ مقدس کے گردونواح کے علاقے شامل ہیں۔ ان اسفار کا جغرافیائی دائرہ افریقہ، بالخصوص مصر اور وادیٔ نیل، سے شروع ہو کر ایشیا کے مختلف علاقوں، یعنی جزیرہ نمائے سینا، شمال مغربی

عرب، اردن اور کنعان تک وسیع تھا۔ بحرِ قلزم اور دریائے اردن اس وسیع جغرافیائی خطے کے درمیان نمایاں جغرافیائی رابطے کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپؑ کے ان سفری مراحل میں صحرائی، ساحلی، پہاڑی، مرتفع، وادی اور زرعی خطوں کی مختلف جغرافیائی صورتیں نمایاں ہوتی ہیں، جو ان کی دعوت، ہجرت، نبوت، بنی اسرائیل کی تربیت اور ارضِ مقدس کی طرف جانے کے مختلف مراحل سے وابستہ تھیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تمام اسفار کی مجموعی مسافت کا حتمی تعین ممکن نہیں، کیونکہ خروجِ مصر، بحرِ قلزم کے عبور، مقامِ طورِ سینا اور بعض دیگر مقامات کی جغرافیائی تعیین کے حوالے سے اہلِ علم اور محققین کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے۔ تاہم تاریخی جغرافیہ، بائبلی مطالعات اور جدید تحقیقی آراء کی بنیاد پر یہ اندازہ پیش کیا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی اور دعوتی سفر کے مختلف مراحل میں تقریباً 2,500 سے 3,500 کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا۔ اگر صحرائے تیہ میں چالیس سال کے دوران ہونے والی مسلسل نقل و حرکت کو بھی اس مجموعی مسافت میں شامل کر لیا جائے تو یہ فاصلہ تقریباً 4,000 کلومیٹر یا اس سے بھی زیادہ ہو سکتا ہے۔6 اس لحاظ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسفار مذہبی، تاریخی اور جغرافیائی اعتبار سے غیر معمولی وسعت کے حامل تھے، جنہوں نے نہ صرف بنی اسرائیل کی قومی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا بلکہ قدیم مشرقِ قریب کی مذہبی اور تہذیبی تاریخ پر بھی نمایاں اثرات مرتب کیے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسفار کی زمانی و جغرافیائی تفصیل

مصر (Egypt)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیاتِ مبارکہ کا ابتدائی مرحلہ مصر ہی سے وابستہ ہے۔ آپؑ کی ولادت، ابتدائی پرورش، فرعون کے محل میں قیام، قبل از نبوت پیش آنے والے اہم واقعات، منصبِ نبوت کے بعد دعوتِ حق کا آغاز، فرعون کے ساتھ معرکۂ حق و باطل اور بنی اسرائیل کی آزادی کے لیے جدوجہد جیسے اہم مراحل اسی سرزمین میں پیش آئے۔ اس لحاظ سے مصر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسفار کا نقطۂ آغاز ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بنیادی اور مرکزی جغرافیائی خطہ بھی تھا، جس نے نہ صرف آپؑ کی شخصیت پر بلکہ دعوتی جدوجہد اور بنی اسرائیل کی تاریخ پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔

قدیم مصر (Ancient Egypt) کا جغرافیائی پھیلاؤ شمال میں بحیرۂ روم، جنوب میں نوبیہ (موجودہ شمالی سوڈان)، مشرق میں بحرِ قلزم اور جزیرہ نمائے سینا، جبکہ مغرب میں صحرائے اعظم (Libyan Desert) تک تھا۔ اس خطے کی تہذیبی ترقی، معاشی سرگرمیوں اور انسانی آبادی کا بنیادی دار و مدار دریائے نیل پر تھا۔ دریائے نیل میں آنے والے سالانہ سیلاب اپنے ساتھ زرخیز مٹی لاتے تھے، جس کے نتیجے میں زرعی زمینوں کی زرخیزی برقرار رہتی اور مصر میں معاشی خوش حالی کے لیے سازگار حالات پیدا ہوتے تھے۔ اسی جغرافیائی حقیقت کی

وضاحت کرتے ہوئے یونانی مؤرخ **ہیروڈوٹس**(Herodotus) نے مصر کو "**Gift of the Nile**" (**نیل کا عطیہ**) قرار دیا، کیونکہ دریائے نیل کے بغیر مصر کا بیشتر جغرافیائی علاقہ ایک وسیع اور خشک صحرائی خطے پر مشتمل ہوتا۔7

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں مصر قدیم مشرقِ قریب کی مضبوط ترین سیاسی اور عسکری سلطنتوں میں شمار ہوتا تھا۔ مسلم مؤرخ ابن جریر طبری کے مطابق فرعون کی حکومت ایک منظم مرکزی نظام پر قائم تھی، جس کا اقتدار وادیٔ نیل سے بڑھ کر سینا کے مشرقی سرحدی علاقوں تک پھیلا ہوا تھا۔ انہی سرحدی راستوں سے شام، فلسطین اور جزیرۂ عرب کی طرف تجارتی اور فوجی قافلے گزرتے تھے، جس کی وجہ سے مصر کو قدیم دنیا میں غیر معمولی تزویراتی (Strategic) اہمیت حاصل تھی۔8

ابن کثیر بیان کرتے ہیں کہ:

"بنی اسرائیل مصر کے مشرقی علاقے، خصوصاً وادیٔ نیل کے مشرقی ڈیلٹا میں آباد تھے، جہاں انہیں زرعی، تعمیراتی اور سرکاری مشقت پر مجبور کیا جاتا تھا۔ اسی ماحول میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرورش فرعون کے محل میں ہوئی، جس سے آپؑ کو مصر کے سیاسی، سماجی اور انتظامی نظام کا براہِ راست مشاہدہ حاصل ہوا۔9

"مسلم جغرافیہ دان المقدسی مصر کو دنیا کے زرخیز ترین ممالک میں شمار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کی خوشحالی مکمل طور پر دریائے نیل، نہری نظام اور زرعی پیداوار پر منحصر تھی"،10

یاقوت بن عبد اللہ الحموی کے نزدیک:

"مصر افریقہ اور بلادِ شام کے درمیان ایک عظیم تجارتی و تہذیبی پل تھا، جہاں سے بین الاقوامی تجارتی شاہراہیں گزرتی تھیں"۔11

سیاسی نقطۂ نظر سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ مصر کے اٹھارہویں اور انیسویں شاہی خاندانوں (18th–19th Dynasties) کے عروج سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس دور میں مصری سلطنت کا سیاسی اثر و رسوخ کنعان اور جنوبی شام کے علاقوں تک قائم تھا۔ چنانچہ آپؑ کی دعوت کو محض مذہبی اصلاح کی ایک کوشش قرار دینا کافی نہیں، بلکہ اس کے ذریعے اس زمانے کی ایک مضبوط سیاسی سلطنت کے جابرانہ نظام اور غلامی پر مبنی طرزِ حکومت کو بھی چیلنج کیا گیا۔12

ثقافتی اعتبار سے قدیم مصر اپنے عہد کی ترقی یافتہ تہذیبوں میں نمایاں مقام رکھتا تھا۔ فنِ تعمیر، طب، فلکیات، ریاضی، آب پاشی، تحریری نظام (Hieroglyphics) اور حکومتی نظم و نسق جیسے شعبوں میں مصری تہذیب نے خاص ترقی حاصل کر رکھی تھی، جس کا اظہار اہرامِ مصر، عظیم معابد، شاہی مقابر اور دیگر شاندار تعمیراتی آثار سے ہوتا ہے۔ تاہم قرآنِ مجید فرعونی مصر کی تہذیب کے ایک دوسرے پہلو کو بھی سامنے لاتا ہے اور فرعون کی حکمرانی کو ظلم، استکبار، طبقاتی استحصال اور خدائی دعوے جیسے رویوں کی نمائندہ قرار دیتا ہے۔ اس تناظر میں

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت مصر کی مادی ترقی اور فرعونی جابرانہ نظام کے مقابلے میں توحید، عدل، آزادی اور انسانی کرامت کے اصولوں پر مبنی ایک مؤثر اصلاحی جدوجہد کے طور پر نمایاں ہوتی ہے۔13

مدین(Midian)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسفار میں مدین ایک اہم دوسرا جغرافیائی مقام ہے، جہاں آپؑ نے مصر سے ہجرت کے بعد کچھ عرصہ قیام فرمایا۔ قرآنِ مجید کے بیان کے مطابق قتلِ قبطی کے واقعے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے روانہ ہوئے اور مدین پہنچے۔ یہاں آپؑ کا تعلق حضرت شعیب علیہ السلام کے خاندان سے قائم ہوا، نکاح ہوا اور تقریباً دس سال تک قیام کے دوران چرواہے کی حیثیت سے عملی زندگی کا تجربہ حاصل کیا۔ اس عرصے میں آپؑ نے صبر، ذمہ داری، قیادت اور مستقبل کی دعوتی جدوجہد کے لیے عملی تربیت حاصل کی (القصص:22–28)۔ اس اعتبار سے مدین حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیاتِ مبارکہ کا ایک اہم عبوری مرحلہ تھا، جہاں شاہی ماحول میں پرورش پانے والا ایک شخص آئندہ عظیم رسول اور قائد کی ذمہ داریوں کے لیے عملی طور پر تیار ہوا۔

جغرافیائی لحاظ سے قدیم مدین بحرِ قلزم، بالخصوص خلیجِ عقبہ، کے مشرقی ساحلی علاقے پر واقع ہے۔ اگرچہ مدین کی دقیق حدود کے تعین کے حوالے سے اہلِ علم کے مابین اختلاف موجود ہے، تاہم عمومی طور پر اسے حجاز کے شمال مغربی حصے، جنوبی اردن اور جزیرۂ عرب کے شمال مغربی علاقوں پر مشتمل ایک قبائلی خطے کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ موجودہ جغرافیائی تناظر میں اس خطے کا بڑا حصہ سعودی عرب کے صوبۂ تبوک، خصوصاً البدع (Al-Bad‘) اور اس کے گرد و نواح سے منطبق کیا جاتا ہے، جبکہ بعض محققین مدین کی جغرافیائی حدود کو خلیجِ عقبہ کے مشرقی ساحل سے لے کر جنوبی اردن تک پھیلا ہوا تصور کرتے ہیں۔14

مسلم جغرافیہ دان یاقوت بن عبد اللہ الحموی کے مطابق:

"مدین بحرِ قلزم کے کنارے حجاز اور شام کے درمیان واقع ایک معروف شہر اور اس کے اطراف کا علاقہ تھا، جس کی نسبت حضرت مدین بن ابراہیم علیہ السلام کی طرف کی جاتی ہے۔15 ابن خرداذبہ اسے مصر، شام اور یمن کو ملانے والی قدیم تجارتی شاہراہ کا اہم پڑاؤ قرار دیتے ہیں 16،"

المقدسی لکھتے ہیں کہ:

"مدین اپنے میٹھے پانی کے کنوؤں، چراگاہوں، کھجوروں کے باغات اور قافلوں کی آمد و رفت کی وجہ سے ایک خوشحال تجارتی مرکز تھا"۔17

المسعودی کے مطابق:

"مدین کی معیشت تجارت، مویشی بانی اور بحرِ قلزم کے ساحلی راستوں کے ذریعے مصر، شام اور جزیرۂ عرب سے ہونے والے تجارتی روابط پر استوار تھی"۔18

جدید تاریخی جغرافیہ دان Barry J. Beitzel مدین کو موجودہ البدع (Al-Bad') اور شمال مغربی سعودی عرب کے علاقے سے منسلک کرتے ہیں19

سیاسی لحاظ سے مدین مصر کی طرح کسی باقاعدہ مرکزی سلطنت کے ماتحت نہیں تھا، بلکہ یہاں مختلف قبائل اپنے اپنے سرداروں کی قیادت میں ایک قبائلی معاشرتی نظام کے تحت زندگی بسر کرتے تھے۔ اس نسبتاً خود مختار ماحول نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعونی ظلم و جبر سے محفوظ رہنے کے لیے ایک پُرامن پناہ گاہ فراہم کی اور انہیں اپنی دعوتی اور قیادی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کا موقع ملا۔ تہذیبی اعتبار سے مدین اگرچہ مصر کے مانند ایک وسیع اور شاندار شہری تہذیب کا مرکز نہیں تھا، تاہم قدیم تجارتی راستوں پر اس کا واقع ہونا اسے معاشی اور تزویراتی اعتبار سے خاص اہمیت عطا کرتا تھا۔ مصر، شام اور جزیرۂ عرب کے درمیان سفر کرنے والے تجارتی قافلے اس خطے سے گزرتے تھے، جس کے نتیجے میں مدین قدیم مشرقِ قریب کے وسیع تجارتی نظام میں ایک اہم مقامی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔20

اس طرح آپؑ کے اسفار میں مدین کو صرف ایک پناہ گاہ کے طور پر نہیں دیکھا جا سکتا، بلکہ یہ آپؑ کی تربیت، روحانی آمادگی اور قیادت کی تشکیل کا ایک اہم مرحلہ تھا، جس نے آپؑ کو آئندہ نبوت کی عظیم ذمہ داری سنبھالنے کے لیے عملی طور پر آمادہ کیا۔ مدین کے جغرافیائی، تاریخی اور تہذیبی پس منظر کا مطالعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت اور ان کے بعد کے دعوتی سفر کی تفہیم کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

وادیِ طُویٰ (Valley of Ṭuwā)

وادیِ مقدس طُویٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسفار میں ایک نہایت اہم اور مقدس جغرافیائی مقام کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں آپؑ کو پہلی مرتبہ منصبِ نبوت سے سرفراز کیا گیا، اللہ تعالیٰ نے آپؑ سے براہِ راست کلام فرمایا اور فرعون کی جانب دعوت و رسالت کی ذمہ داری آپؑ کے سپرد کی گئی۔ قرآنِ مجید میں اس مقام کو نہایت تعظیم کے ساتھ "الوادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى" کے الفاظ سے بیان کیا گیا ہے:

إِنِّي أَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى21

میں تو تمہارا پروردگار ہوں تو اپنی جوتیاں اتار دو۔ تم یہاں پاک میدان طویٰ میں ہو

اسی طرح سورۃ النازعات کی آیت 16 میں بھی وادیِ طُویٰ کا ذکر ملتا ہے، جس سے اس مقام کی مذہبی اور تاریخی اہمیت مزید نمایاں ہوتی ہے۔

جغرافیائی اعتبار سے وادیِ طُویٰ کو کوہِ طور (Mount Sinai) کے دامن میں واقع ایک مقدس وادی سے منسوب کیا جاتا ہے، تاہم اس کے صحیح اور متعین محلِ وقوع کے بارے میں قدیم و جدید محققین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ روایتی یہودی، مسیحی اور اسلامی تصورات کے مطابق اس مقام کو جزیرہ نمائے سینا کے جنوبی حصے میں واقع جبلِ موسیٰ اور جبلِ صفصافہ کے گرد و نواح سے متعلق قرار دیا جاتا ہے،22 جہاں بعد کے زمانے میں دیرِ سینٹ کیتھرین (St. Catherine's Monastery) بھی قائم ہوئی۔ اس کے برعکس بعض جدید محققین، بالخصوص James K. Hoffmeier اور دیگر ماہرینِ تاریخی جغرافیہ، یہ امکان پیش کرتے ہیں کہ وادیِ طُویٰ کا محلِ وقوع شمالی یا وسطی سینا کے علاقوں سے بھی متعلق ہو سکتا ہے۔ ایک جدید نظریہ اسے شمال مغربی سعودی عرب کے علاقے سے بھی منسلک کرتا ہے،23 تاہم اس موقف کی تائید میں تاحال ایسے قطعی آثارِ قدیمہ کے شواہد دستیاب نہیں جو اس تعیین کو حتمی قرار دے سکیں۔

مسلم مفسرین نے بھی وادیِ طُویٰ کی تقدیس اور اس کی مذہبی اہمیت کو خصوصی طور پر بیان کیا ہے۔ **امام طبری** کے مطابق اس وادی کو "مقدس" قرار دیے جانے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسی مقام پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو منصبِ نبوت سے سرفراز فرمایا۔24

جدید بائبلی جغرافیہ دان Barry J. Beitzel کے مطابق وادیِ طُویٰ کی صحیح جغرافیائی تعیین آج بھی تاریخی جغرافیہ کے پیچیدہ مسائل میں سے ایک ہے، کیونکہ قرآنِ مجید اور بائبلی متون اس کے عمومی محلِ وقوع کا ذکر کرتے ہیں، مگر ایسی تفصیلات فراہم نہیں کرتے جن سے کسی ایک مقام کو یقینی طور پر متعین کیا جا سکے25

جغرافیائی اعتبار سے وادیِ طُویٰ ایک خشک اور پہاڑی علاقے میں واقع تھی، جہاں سنگلاخ پہاڑوں، تنگ وادیوں اور موسمی پانی کے گزرگاہی راستوں (Wadis) کا وجود پایا جاتا تھا۔ اگرچہ زرعی نقطۂ نظر سے یہ علاقہ زیادہ سازگار نہیں تھا، تاہم قدیم دور میں مدین، جزیرۂ سینا اور مصر کے درمیان سفر کے لیے استعمال ہونے والے بعض صحرائی راستے اسی خطے سے وابستہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مدین سے مصر کی جانب واپسی کے سفر میں وادیِ طُویٰ کو ایک اہم جغرافیائی مرحلہ قرار دیا جاتا ہے۔26

اس اعتبار سے وادیِ طُویٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسفار میں محض ایک جغرافیائی مقام نہیں، بلکہ آپؑ کی نبوت کے آغاز، نزولِ وحی، اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی اور فرعون کی طرف دعوت و رسالت کے آغاز سے وابستہ ایک نہایت اہم مقام ہے۔ یہیں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کا ایک نیا مرحلہ شروع ہوا، جہاں جلاوطنی کی زندگی گزارنے والے ایک فرد نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے عظیم رسول، مصلح اور اپنی قوم کے رہنما کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کا آغاز کیا۔

بحر قلزم(Red Sea)

بحرِ قلزم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسفار میں ایک نہایت اہم اور فیصلہ کن جغرافیائی مقام کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو فرعون اور اس کے لشکر کے تعاقب سے نجات عطا فرمائی۔ قرآنِ مجید کے مطابق خروجِ مصر کے بعد جب بنی اسرائیل سمندر کے کنارے پہنچے اور فرعونی لشکر نے انہیں پیچھے سے گھیر لیا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے عصا سے سمندر پر ضرب لگائی، جس کے نتیجے میں سمندر شق ہو گیا اور بنی اسرائیل خشک راستے سے گزر گئے، جبکہ فرعون اور اس کا لشکر غرق ہو گیا۔27

یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے عظیم معجزات میں شمار ہوتا ہے اور بنی اسرائیل کی غلامی سے آزادی اور ان کی نئی مذہبی و سیاسی شناخت کے آغاز کی علامت بھی قرار پاتا ہے۔

قدیم جغرافیائی اصطلاح میں بحرِ قلزم (Sinus Arabicus) سے مراد موجودہ بحرِ احمر (Red Sea) اور اس کی شمالی دو شاخیں، یعنی خلیجِ سویز (Gulf of Suez) اور خلیجِ عقبہ (Gulf of Aqaba)، لی جاتی تھیں۔ یہ سمندری خطہ شمالی جانب جزیرہ نمائے سینا کو افریقہ اور جزیرۂ عرب سے جدا کرتا ہے، جبکہ جنوب میں باب المندب کے راستے بحرِ عرب سے جا ملتا ہے۔ اس کے مشرقی جانب جزیرۂ عرب اور مغربی جانب مصر، سوڈان اور اریٹیریا کے علاقے واقع ہیں۔ قدیم دور میں بحرِ قلزم مصر، جزیرۂ عرب، افریقہ اور بلادِ شام کے درمیان تجارتی سرگرمیوں، بحری آمد و رفت اور عسکری نقل و حرکت کے لیے ایک اہم سمندری راستے کی حیثیت رکھتا تھا۔28

المقدسی نے بھی بحرِ قلزم کو قدیم دنیا کی اہم بحری شاہراہوں میں شمار کیا ہے، جہاں سے مصر، یمن، حجاز اور مشرقی افریقہ کے درمیان تجارتی قافلے اور بحری جہاز مسلسل آمد و رفت کرتے تھے۔ اس طرح بحرِ قلزم نہ صرف ایک جغرافیائی حد تھی بلکہ قدیم مشرقِ قریب کے تجارتی، معاشی اور تہذیبی نظام کا ایک بنیادی عنصر بھی تھا۔29

سیاسی اور عسکری نقطۂ نظر سے بحرِ قلزم کو غیر معمولی اہمیت حاصل تھی۔ یہ مصر کی مشرقی جانب ایک قدرتی دفاعی حد کے طور پر موجود تھا اور اسی سمندری راستے کے ذریعے مصر کا تعلق جزیرۂ عرب، افریقہ اور بحرِ ہند کے تجارتی بحری نظام سے قائم تھا۔ اسی پس منظر میں فرعون کی فوج کی جانب سے بنی اسرائیل کا تعاقب محض ایک تعاقبی کارروائی نہیں بلکہ ایک تزویراتی مہم کی صورت بھی رکھتا تھا۔ دوسری جانب بنی اسرائیل کے لیے بحرِ قلزم کو پار کرنا غلامی کے خاتمے، فرعونی اقتدار سے نجات اور ایک آزاد قوم کی حیثیت سے نئی زندگی کے آغاز کی علامت بن گیا۔

جغرافیائی اعتبار سے بحرِ قلزم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسفار میں ایک اہم موڑ (Turning Point) کی حیثیت رکھتا ہے۔ مصر سے خروج کے بعد یہی وہ مقام تھا جہاں بنی اسرائیل کی غلامی کی زندگی کا ایک مرحلہ اختتام پذیر ہوا اور آزادی، شریعت اور قومی تشکیل کی جانب ان کے سفر کا نیا مرحلہ شروع ہوا۔ اسی وجہ سے اس کی اہمیت محض ایک آبی گزرگاہ تک محدود نہیں رہتی، بلکہ قرآنی تاریخ، تاریخی جغرافیہ اور اسلامی فکر کے تناظر میں یہ ایک اہم مذہبی اور تہذیبی علامت کے طور پر بھی سامنے آتا ہے۔

جزیرہ نمائے سینا (Sinai Peninsula)

جزیرہ نمائے سینا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسفار میں ایک مرکزی اور جغرافیائی اہمیت ہے۔ یہی وہ سرزمین ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو منصبِ نبوت عطا کیا گیا، اللہ تعالیٰ نے وادیِ مقدس طُویٰ میں آپؑ سے کلام فرمایا، خروجِ مصر کے بعد بنی اسرائیل نے ایک طویل مدت یہاں قیام کیا، شریعتِ موسوی نازل ہوئی اور ان کی دینی، اخلاقی اور اجتماعی تربیت کے متعدد اہم مراحل مکمل ہوئے۔ اس اعتبار سے جزیرہ نمائے سینا محض ایک جغرافیائی علاقہ نہیں بلکہ اسلامی، یہودی اور مسیحی روایات میں ایک مقدس اور تاریخی سرزمین کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔

جغرافیائی لحاظ سے جزیرہ نمائے سینا افریقہ اور ایشیا کے درمیان واقع ایک مثلث نما زمینی خطہ ہے، جس کی شمالی جانب بحیرۂ روم، مغربی جانب خلیجِ سویز، مشرقی جانب خلیجِ عقبہ اور جنوبی سمت بحرِ قلزم (بحرِ احمر) واقع ہے۔ اس کا مجموعی رقبہ تقریباً 60 ہزار مربع کلومیٹر بیان کیا جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں یہ خطہ مصر، شام اور جزیرۂ عرب کے شمال مغربی علاقوں کے درمیان ایک قدرتی زمینی پل (Land Bridge) کا کردار ادا کرتا تھا، جس کے ذریعے افریقہ اور ایشیا کو باہم ملانے والی اہم فوجی اور تجارتی شاہراہیں گزرتی تھیں۔

"یونانی جغرافیہ دان **Strabo** اپنی کتاب **Geographica** میں لکھتے ہیں کہ مصر سے عرب اور شام جانے والے زمینی راستے سینا سے گزرتے تھے،"30

"Herodotus نے اسے مصر کا مشرقی دفاعی دروازہ قرار دیا ہے 31

قدیم زمانے میں جزیرہ نمائے سینا کی سیاسی حدود آج کی قومی سرحدوں کی طرح واضح اور متعین نہیں تھیں۔ فرعونی سلطنت کے عروج کے دور میں اس کے شمالی اور مغربی علاقے مصر کے سیاسی اثر و رسوخ میں شامل تھے، جبکہ جنوبی اور مشرقی حصوں میں مدیانی، عمالیقی اور دیگر سامی قبائل آباد تھے۔ مسلم جغرافیہ دان یاقوت الحموی کے بیان کے مطابق سینا مصر اور حجاز کے درمیان واقع ایک پہاڑی و صحرائی خطہ تھا، جہاں سے شام، مصر اور عرب کی سمت جانے والے تجارتی قافلے گزرتے تھے۔

قدرتی جغرافیہ کے اعتبار سے جزیرہ نمائے سینا کو عمومی طور پر تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

شمالی سینا

اس کا شمالی علاقہ نسبتاً ہموار اور نیم صحرائی میدانوں پر مشتمل ہے، جہاں قدیم زمانے کی معروف "راہِ حورس"(Way of Horus) مصر کو فلسطین سے ملانے والے اہم راستے کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔

وسطی سینا

وسطی سینا میں زیادہ تر سنگلاخ سطح مرتفع اور خشک وادیاں پائی جاتی ہیں،

جنوبی سینا

جنوبی سینا بلند گرینائٹ پہاڑی سلسلوں پر مشتمل ہے۔ اسی جنوبی حصے میں جبلِ موسیٰ (Jebel Musa)، جبلِ کاترینہ (Mount Catherine) اور دیگر بلند پہاڑی چوٹیاں واقع ہیں۔ روایتی طور پر اسی علاقے کو مقامِ طور اور وادیِ طُویٰ سے منسوب کیا جاتا ہے، تاہم ان مقامات کے حتمی محلِ وقوع کے بارے میں اہلِ علم کے درمیان اختلاف موجود ہے۔32

تہذیبی اور معاشی لحاظ سے سینا میں مصر یا بین النہرین کی طرح بڑی شہری تہذیبیں وجود میں نہیں آئیں، تاہم زمانہ قدیم میں اسے معدنی وسائل کے حوالے سے خاص اہمیت حاصل تھی۔ فرعونی دور میں اس خطے سے فیروزہ(Turquoise) اور تانبہ (Copper) نکالا جاتا تھا۔ وادی المغارہ(Wadi Maghara) اور سرابیط الخادم(Serabit el-Khadim) میں موجود قدیم کانیں، معابد اور فرعونی کتبے اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ تیسری ہزار قبل مسیح سے لے کر نئی سلطنت(New Kingdom) کے دور تک مصری حکومت اس علاقے میں منظم انداز سے معدنی وسائل کے حصول کے لئے سرگرم رہی۔33

صحرائے تیہ(Wilderness of Tih)

صحرائے تیہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسفار کا ایک اہم جغرافیائی، تاریخی اور تربیتی مرحلہ تھا۔ بنی اسرائیل کی جانب سے ارضِ مقدس میں داخل ہونے سے انکار اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کے نتیجے میں انہیں چالیس سال تک اس خطے میں قیام کرنا پڑا۔ قرآنِ مجید میں فرمایا گیا:

فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ،"

یہ سرزمین ان پر چالیس سال کے لیے حرام کر دی گئی، وہ زمین میں سرگرداں رہیں گے۔")34

جغرافیائی لحاظ سے صحرائے تیہ (Wilderness of Tih) جزیرہ نمائے سینا کے شمالی و وسطی علاقے میں پھیلا ہوا ایک وسیع صحرائی خطہ ہے، جس کی ساخت زیادہ تر چونے کے پتھریلے سطح مرتفع(Limestone Plateau) پر مشتمل ہے۔ اس کے جنوبی جانب جنوبی سینا کے

پہاڑی سلسلے، شمال میں بحیرۂ روم کے ساحلی میدان، مشرق میں قادش برنیع اور نقب (Negev)، جبکہ مغرب میں وادیٔ نیل اور خلیجِ سویز کے علاقے واقع ہیں۔ موجودہ جغرافیائی تقسیم کے مطابق اس خطے کا بڑا حصہ مصر کے شمالی سینا گورنری میں شامل ہے، جبکہ اس کا مشرقی حصہ اسرائیل اور غزہ کے صحرائی علاقوں سے متصل ہے۔ عربی زبان میں لفظ "تیہ" کے معنی سرگردانی، حیرانی اور راستہ بھٹکنے کے ہیں، جو قرآنِ مجید میں بنی اسرائیل کی اسی کیفیت کی عکاسی کرتے ہیں۔35

المقدسی لکھتے ہیں کہ:

"یہ خطہ مستقل آبادی کے لیے موزوں نہیں تھا، تاہم قدیم زمانے میں مصر، فلسطین اور جزیرۂ عرب کے درمیان گزرنے والے بعض قافلے اسی علاقے سے گزرتے تھے۔ المقدسی کے مطابق صحرائے تیہ اپنی سخت آب و ہوا، شدید گرمی اور پانی کی قلت کے باعث قدیم دنیا کے دشوار ترین صحرائی علاقوں میں شمار ہوتا تھا"۔36

قدرتی جغرافیہ کے لحاظ سے صحرائے تیہ خشک میدانوں، پتھریلے مرتفعات، ریتلے علاقوں اور موسمی وادیوں پر مشتمل تھا۔ یہاں بارش، نباتات اور قدرتی آبی ذرائع محدود ہونے کے باعث بڑی مستقل شہری تہذیبیں فروغ نہ پا سکیں، تاہم قدیم تجارتی قافلے اور خانہ بدوش قبائل اس خطے سے گزرتے رہے۔ آثارِ قدیمہ میں بعض مقامات پر کنوؤں، چراگاہوں اور عارضی قیام گاہوں کے شواہد بھی ملتے ہیں۔

سیاسی اعتبار سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں صحرائے تیہ کسی ایک ریاست کے مکمل اقتدار میں نہیں تھا۔ مغربی حصوں پر مصر کا محدود اثر تھا، جبکہ مشرقی اور جنوبی علاقوں میں مختلف بدوی اور سامی قبائل آباد تھے۔ اس غیر مرکزی ماحول میں بنی اسرائیل فرعونی اقتدار سے آزاد ہو کر اجتماعی اور تربیتی مراحل سے گزرے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسفار میں صحرائے تیہ کی اہمیت اس لیے بھی نمایاں ہے کہ یہ بنی اسرائیل کی عملی، اخلاقی اور اجتماعی تربیت کا اہم مرحلہ تھا۔ اسی دوران انہیں منّ و سلویٰ عطا ہوا، چٹان سے بارہ چشمے جاری ہوئے اور شریعت کی تعلیمات پر عمل کی تربیت دی گئی۔ یوں صحرائے تیہ محض سزا کا مقام نہیں بلکہ ایک آزاد اور منظم قوم کی تشکیل کی اہم تربیت گاہ تھا۔

Kenneth A. Kitchen لکھتے ہیں کہ:

"چالیس سالہ قیام کو تاریخی جغرافیہ کے تناظر میں سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسے مسلسل بے مقصد گردش کے بجائے مختلف صحرائی مقامات کے درمیان موسمی نقل و حرکت اور تدریجی تربیت کے عمل کے طور پر دیکھا جائے۔"37

یوں صحرائے تیہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسفار کا ایک نمایاں جغرافیائی اور تربیتی مرحلہ قرار پاتا ہے، جہاں آزمائش، تربیت، شریعت اور قومی تشکیل کے مختلف پہلو یکجا ہوتے ہیں۔ یہی وہ خطہ ہے جہاں بنی اسرائیل نے غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے بعد ایک منتشر قوم سے منظم امت بننے کی جانب اہم پیش رفت کی۔

قادش برنیع (Kadish Barnea)

قادش برنیع حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسفار میں ایک اہم جغرافیائی، تاریخی اور دینی مقام کی حیثیت رکھتا ہے، جہاں بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایک فیصلہ کن مرحلہ پیش آیا۔ یہی وہ مقام تھا جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو ارضِ مقدس (کنعان) میں داخلے کے لیے تیار کیا اور کنعان کے حالات معلوم کرنے کی غرض سے بارہ نمائندے روانہ کیے۔ تاہم ان کی منفی رپورٹ اور بنی اسرائیل کی کمزوری و نافرمانی کے نتیجے میں انہیں چالیس سال تک صحرائے تیہ میں سرگرداں رہنے کا حکم دیا گیا۔ اس اعتبار سے قادش برنیع حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسفار میں آزادی کے بعد پیش آنے والی آزمائش، اہم فیصلے اور بنی اسرائیل کی نئی قومی تاریخ کے آغاز کا ایک نمایاں سنگِ میل ہے۔

جغرافیائی لحاظ سے قادش برنیع جزیرہ نمائے سینا کے شمال مشرقی سرے اور جنوبی کنعان (جنوبی فلسطین) کی سرحد کے قریب واقع ایک قدیم نخلستان (Oasis) تھا۔ بیشتر جدید محققین اس مقام کی شناخت موجودہ عین القدیرات (Ain el-Qudeirat) اور اس کے گرد و نواح سے کرتے ہیں، جو موجودہ مصر، اسرائیل اور شمالی سینا کے سرحدی علاقے میں واقع ہے۔ اس کے مغرب میں صحرائے تیہ، مشرق میں ادوم، شمال میں نقب (Negev) اور جنوب میں وسطی سینا کے علاقے واقع تھے۔ اس محلِ وقوع نے اسے خصوصی جغرافیائی اہمیت عطا کی، کیونکہ مصر سے کنعان کی طرف جانے والے متعدد زمینی راستے یہاں سے گزرتے یا باہم ملتے تھے، جس کے باعث یہ مقام قدیم دور میں تجارتی اور عسکری سرگرمیوں کے لیے ایک اہم پڑاؤ سمجھا جاتا تھا۔38

بائبلی جغرافیہ کے ماہر Barry J. Beitzel کے مطابق:

"قادش برنیع جنوبی کنعان کا سب سے اہم سرحدی مرکز تھا، جہاں سے بنی اسرائیل کے لیے ارضِ مقدس میں داخل ہونا جغرافیائی طور پر سب سے زیادہ ممکن اور مختصر راستہ تھا"۔39

قدرتی جغرافیائی اعتبار سے قادش برنیع اگرچہ صحرائی خطے میں واقع تھا، تاہم قدرتی چشمے اور نخلستان کے باعث اسے قدیم زمانے میں مسافروں، تجارتی قافلوں اور خانہ بدوش قبائل کے لیے ایک اہم قیام گاہ بنا دیا تھا۔ آثارِ قدیمہ سے یہاں قدیم قلعوں، آبی ذخائر اور آبادی

کے شواہد ملے ہیں، جو اس مقام کے مصر، کنعان اور ادوم کے درمیان سرحدی نگرانی اور تجارتی سرگرمیوں میں استعمال ہونے کی نشاندہی کرتے ہیں۔40

سیاسی لحاظ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں قادش برنیع مصر، ادوم اور جنوبی کنعان کے درمیان ایک اہم سرحدی خطہ تھا۔ اگرچہ یہ کسی بڑی سلطنت کا دارالحکومت نہیں تھا، تاہم اپنی تزویراتی اہمیت کے باعث یہ جنوبی کنعان کی سرحد اور اس سے متصل علاقوں کی نگرانی کے لیے ایک نمایاں مقام کی حیثیت رکھتا تھا۔41

Kenneth A. Kitchen بھی اسے جنوبی فلسطین کا ایک اہم سرحدی مقام قرار دیتے ہیں، جس کی شناخت آثارِ قدیمہ اور تاریخی جغرافیہ سے بڑی حد تک مطابقت رکھتی ہے۔42

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسفار میں قادش برنیع کی بنیادی اہمیت یہ ہے کہ اسی مقام پر بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے باوجود ارضِ مقدس میں داخل ہونے سے گریز کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کنعان کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے بارہ نمائندے روانہ کیے، لیکن ان میں سے دس نے وہاں کے باشندوں کی قوت اور مضبوط قلعوں کا ذکر کر کے قوم میں خوف پیدا کیا، جبکہ حضرت یوشع بن نون علیہ السلام اور حضرت کالبؑ نے اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرتے ہوئے آگے بڑھنے کی ترغیب دی۔ بنی اسرائیل کی نافرمانی کے نتیجے میں انہیں چالیس سال تک صحرائے تیہ میں رہنے کا حکم دیا گیا۔ یوں قادش برنیع آزادی کے بعد بنی اسرائیل کے پہلے بڑے امتحان اور اس کے دوررس تاریخی نتائج کی ایک اہم علامت بن گیا۔

ادوم (Edom)

ادوم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسفار میں ایک اہم سرحدی اور سیاسی خطہ تھا، جس کا تعلق حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے حضرت عیسو علیہ السلام کی نسل سے تھا۔ اگرچہ قرآنِ مجید میں ادوم کا نام صراحتاً مذکور نہیں، تاہم مفسرین اور مؤرخین کے مطابق بنی اسرائیل نے یہاں سے گزرنے کی اجازت طلب کی، لیکن ادومی حکمران نے انکار کر دیا۔ چنانچہ بنی اسرائیل کو متبادل راستہ اختیار کرنا پڑا، جس سے ان کے سفر کی سمت تبدیل ہوئی اور مسافت میں اضافہ ہوا۔43

جغرافیائی لحاظ سے ادوم بحر مردار (Dead Sea) کے جنوبی علاقے سے خلیج عقبہ (Gulf of Aqaba) تک پھیلا ہوا ایک وسیع پہاڑی خطہ تھا۔ اس کی مغربی جانب وادیٔ عربہ (Arabah Valley)، مشرق میں صحرائے عرب، شمال میں موآب جبکہ جنوب میں شمال مغربی حجاز کے علاقے واقع تھے۔ موجودہ جغرافیائی تقسیم کے مطابق ادوم کا زیادہ تر حصہ جنوبی اردن کے صوبہ معان (Ma'an) اور عقبہ (Aqaba)

کے علاقوں میں شامل ہے، جبکہ اس کا جنوبی حصہ شمال مغربی سعودی عرب سے متصل ہوتا ہے۔ اس خطے کا مجموعی رقبہ تقریباً 15 سے 20 ہزار مربع کلومیٹر کے درمیان بیان کیا جاتا ہے۔44

قدیم مؤرخین کے مطابق ادوم اپنی دشوار گزار پہاڑی ساخت کے باعث ایک مضبوط قدرتی دفاعی خطے کی حیثیت رکھتا تھا۔

یونانی جغرافیہ دان Strabo لکھتے ہیں کہ:

ادوم بلند پہاڑوں، تنگ گھاٹیوں اور دشوار گزار راستوں کی وجہ سے قدرتی قلعے کی حیثیت رکھتا تھا۔45

المقدسی کے مطابق:

یہ خطہ قدیم تجارتی شاہراہ "شاہراہِ ملوک" (King's Highway) کے قریب واقع تھا، جس کی وجہ سے مصر، شام اور جزیرۂ عرب کے درمیان سفر کرنے والے قافلے یہاں سے گزرتے تھے۔

المقدسی بھی ادوم کو ایک سرحدی اور تجارتی اہمیت رکھنے والا علاقہ قرار دیتے ہیں۔46

قدرتی جغرافیہ کے لحاظ سے ادوم کا خطہ سرخی مائل پتھریلے پہاڑوں، گہری وادیوں اور خشک میدانوں پر مشتمل تھا۔ غالب امکان ہے کہ یہاں کی سرخ مٹی اور چٹانوں ہی کی نسبت سے اسے "ادوم"، یعنی سرخ، کہا گیا۔ اس علاقے کی نمایاں وادی وادیٔ عربہ تھی، جو بحرِ مردار کو خلیجِ عقبہ سے ملاتی ہے۔ اگرچہ یہاں بارش کی مقدار کم تھی، تاہم پہاڑی چشموں اور موسمی وادیوں کی موجودگی نے محدود پیمانے پر زراعت کے امکانات پیدا کیے۔ مزید برآں، تانبے (Copper) کی کانوں نے ادوم کو معاشی اعتبار سے بھی اہم بنا دیا تھا۔ موجودہ فینان (Faynan) کے علاقے سے ملنے والی قدیم کانیں اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ ادوم دھاتوں کی پیداوار کا ایک اہم مرکز رہا ہے۔47

سیاسی لحاظ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ادوم ایک قبائلی ریاست کی صورت میں قائم تھا اور اس کی اپنی مقامی قیادت موجود تھی۔ اگرچہ اسے مصر جیسی وسیع سلطنت حاصل نہیں تھی، تاہم اس کا دشوار گزار پہاڑی جغرافیہ اور اہم تجارتی راستوں پر اثر و رسوخ اسے ایک مضبوط علاقائی قوت بناتا تھا۔

Kenneth A. Kitchen اسے خروجِ مصر کے بعد بنی اسرائیل کے سفر میں پیش آنے والی اہم سیاسی رکاوٹ قرار دیتے ہیں۔48

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسفار میں ادوم کی اہمیت اس واقعے سے واضح ہوتی ہے جب بنی اسرائیل نے پرامن طور پر اس کی سرزمین سے گزرنے کی اجازت طلب کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کھیتوں، باغات اور پانی کو نقصان نہ پہنچانے کی یقین دہانی کرائی، تاہم ادومیوں نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تصادم سے گریز کرتے ہوئے متبادل راستہ اختیار کیا اور بنی اسرائیل موآب کی جانب روانہ ہوئے۔ یہ واقعہ آپؑ کی سیاسی بصیرت اور غیر ضروری جنگ سے اجتناب کی نمایاں مثال ہے۔

تحقیقی اعتبار سے جدید آثارِ قدیمہ نے ادوم کی تاریخی حیثیت کی بڑی حد تک تائید کی ہے۔Barry J. Beitzel کے مطابق ادوم کا جغرافیہ، وادیٔ عربہ، شاہراہِ ملوک اور جنوبی اردن کے پہاڑی سلسلوں سے مکمل مطابقت رکھتا ہے۔ اسی طرحAmihai Mazar اور دیگر ماہرین آثارِ قدیمہ نے جنوبی اردن میں دریافت ہونے والی کان کنی، قلعہ بندی اور آبادیوں کے آثار کی بنیاد پر ادوم کو ایک منظم علاقائی مملکت قرار دیا ہے، اگرچہ اس کی سیاسی قوت مختلف ادوار میں کم و بیش ہوتی رہی۔49

یوں ادوم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسفار کا ایک اہم سرحدی و سیاسی خطہ تھا، جہاں جغرافیہ اور علاقائی سیاست باہم مربوط تھے۔ یہاں سے گزرنے کی اجازت نہ ملنے سے بنی اسرائیل کا راستہ تبدیل ہوا اور اس دور کے قبائلی سیاسی تعلقات بھی نمایاں ہوئے۔

موآب(Moab)

موآب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسفار کا آخری اور اہم جغرافیائی خطہ تھا، جہاں بنی اسرائیل نے چالیس سالہ صحرائی سفر کے اختتام پر قیام کیا۔ اسی مقام پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کی نئی نسل کی تربیت و تنظیم کی، شریعت کی تجدید فرمائی اور حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کو آئندہ قیادت کے لیے تیار کیا۔ ارضِ مقدس میں داخلے سے قبل آپؑ نے بنی اسرائیل کو ضروری ہدایات بھی دیں، جبکہ اسی خطے کے قریب واقع جبلِ نبو سے آپؑ نے ارضِ مقدس کا مشاہدہ کیا۔ اس اعتبار سے موآب آپؑ کے سفری مراحل کا اختتامی مقام اور بنی اسرائیل کی قومی تاریخ کے ایک نئے دور کا نقطۂ آغاز تھا۔

جغرافیائی لحاظ سے موآب دریائے اردن کے مشرقی جانب واقع ایک بلند مرتفع (Transjordanian Plateau) خطہ تھا، جو شمال میں دریائے ارنون (Wadi al-Mujib)، جنوب میں وادیِ زرد (Wadi al-Hasa)، مغرب میں بحر مردار (Dead Sea) اور مشرق میں صحرائے عرب تک پھیلا ہوا تھا۔ موجودہ جغرافیائی تقسیم کے مطابق اس کا زیادہ تر حصہ اردن کے صوبہ کرک (Karak) اور مادبا (Madaba) میں شامل ہے۔ موآب کا یہ مرتفع سطحِ سمندر سے تقریباً700 سے 1,200 میٹر کی بلندی پر واقع تھا، جس کے باعث یہاں کا موسم گرد و نواح کے صحرائی علاقوں کے مقابلے میں نسبتاً معتدل اور زرعی سرگرمیوں کے لیے زیادہ سازگار تھا۔50

یہودی مؤرخ جوزیفس (Josephus) کے مطابق:

موآب بحر مردار کے مشرق میں واقع ایک مضبوط علاقہ تھا، جس کی بلند جغرافیائی حیثیت اسے قدرتی دفاع فراہم کرتی تھی اور جہاں سے دریائے اردن کی وادی اور اریحا کے میدانوں تک رسائی ممکن تھی۔51

المقدسی کے مطابق:

اردن کے مشرقی مرتفع علاقے پانی، چراگاہوں اور زرعی پیداوار کی فراوانی کی وجہ سے بلادِ شام کے اہم زرعی خطوں میں شمار ہوتے تھے، جبکہ ابو الفداء نے موآب اور اس سے ملحق مرتفع علاقوں کو جنوبی شام کے اہم جغرافیائی خطوں میں شامل کرتے ہوئے انہیں قدیم تجارتی شاہراہوں، خصوصاً شاہراہِ ملوک (King's Highway)، سے منسلک قرار دیا ہے، جس کے ذریعے شام، حجاز اور جزیرۂ عرب کے درمیان قافلوں کی آمد و رفت ہوتی تھی۔52

قدرتی جغرافیہ کے لحاظ سے موآب صحرائے تیہ اور ادوم کے مقابلے میں زیادہ زرخیز اور نسبتاً سرسبز مرتفع تھا۔ یہاں موسمی بارشوں کے باعث چشمے، وادیاں اور چراگاہیں موجود تھیں، جبکہ گندم، جو، انگور اور زیتون کی کاشت نے اسے قدیم دور میں زراعت اور مویشی بانی کا اہم مرکز بنا دیا تھا۔ دریائے اردن اور بحرِ مردار سے بلند ہونے کے باعث اس خطے کو قدرتی دفاعی اہمیت بھی حاصل تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسفار میں موآب آخری اہم مرحلہ تھا، جہاں چالیس سالہ صحرائی قیام کے بعد بنی اسرائیل کی نئی نسل جمع ہوئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہاں شریعت کی تجدید، عہدِ الٰہی کی یاد دہانی اور ارضِ مقدس میں داخلے کی تیاری مکمل کرائی اور حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کو قیادت کے لیے تیار کیا۔ اسی خطے کے قریب جبلِ نبو سے آپؑ نے ارضِ مقدس کا مشاہدہ کیا، یوں موآب آپؑ کے سفری اور دعوتی مراحل کا اختتامی مقام قرار پایا۔

جدید تاریخی جغرافیہ کے ماہرین کے مطابق موآب کا انتخاب جغرافیائی اعتبار سے نہایت موزوں تھا۔

James K. Hoffmeier کے نزدیک:

دریائے اردن کے مشرقی مرتفع علاقوں کا مطالعہ اس امر کی تائید کرتا ہے کہ بنی اسرائیل کی آخری منزل موآب کا میدان تھا، جہاں سے دریائے اردن عبور کر کے کنعان میں داخل ہونا جغرافیائی لحاظ سے زیادہ مناسب تھا۔

Barry J. Beitzel کے مطابق:

موآب کا بلند مرتفع، خصوصاً جبلِ نبو کے اطراف، دریائے اردن، اریحا اور مغربی کنعان پر وسیع طبعی منظر (Panoramic View) فراہم کرتا ہے، جو بائبلی اور قرآنی روایات کے جغرافیائی پس منظر سے مطابقت رکھتا ہے53

آثارِ قدیمہ سے بھی موآب کی تاریخی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ ذیبان (Dhiban) سے دریافت ہونے والا موآبی پتھر (Mesha Stele)، اگرچہ نویں صدی قبل مسیح کے موآبی بادشاہ میشع کے دور سے متعلق ہے، تاہم موآب کے منظم سیاسی نظام، زبان اور مذہبی و علاقائی شناخت کا اہم ثبوت فراہم کرتا ہے۔54

یوں موآب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسفار کا اختتامی اور فیصلہ کن مرحلہ تھا، جہاں چالیس سالہ تربیتی سفر مکمل ہوا، نئی نسل قیادت کے لیے تیار ہوئی اور بنی اسرائیل نے حضرت یوشع علیہ السلام کی قیادت میں ارضِ مقدس میں داخلے کی تیاری مکمل کی۔ جغرافیائی، سیاسی، مذہبی اور تہذیبی اعتبار سے موآب کو آپؑ کے اسفار میں نمایاں مقام حاصل ہے۔

جبلِ نبو(Mount Nebo)

جبلِ نبو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسفار کا آخری اہم جغرافیائی مقام ہے، جہاں آپؑ نے اپنی حیاتِ مبارکہ کے آخری ایام میں ارضِ مقدس کا مشاہدہ فرمایا۔ اسلامی روایات اور تاریخی مصادر کے مطابق آپؑ ارضِ مقدس کے قریب پہنچے، لیکن اس میں داخل نہ ہو سکے۔ اگرچہ قرآنِ مجید میں جبلِ نبو کا نام صراحتاً مذکور نہیں، تاہم مفسرین اور مؤرخین نے اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آخری قیام سے منسوب کیا ہے، جبکہ تورات اور بعد کی روایات میں اس کا ذکر زیادہ تفصیل سے ملتا ہے۔

جغرافیائی لحاظ سے جبلِ نبو موجودہ اردن کے صوبہ مادبا(Madaba) میں موآب کے مرتفع کا حصہ ہے۔ یہ بحرِ مردار کے مشرقی کنارے سے تقریباً10 کلومیٹر اور دریائے اردن سے تقریباً15 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، جبکہ اس کی بلند ترین چوٹی تقریباً817 میٹر بلند ہے۔ یہاں سے وادیٔ اردن، اریحا، بحرِ مردار اور کنعان کے وسیع علاقے دکھائی دیتے ہیں، جس کی وجہ سے اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آخری سفر اور ارضِ مقدس کے مشاہدے سے متعلق اہم مقام سمجھا جاتا ہے۔55

قدیم مؤرخین نے جبلِ نبو کو موآب کے بلند مرتفع کا حصہ قرار دیا ہے۔ جوزیفس(Josephus) کے مطابق:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی پہاڑی سلسلے سے ارضِ کنعان کا مشاہدہ کیا۔ بعد کی یہودی، مسیحی اور اسلامی روایات میں بھی یہ نسبت عمومی طور پر بیان کی گئی ہے۔56

قدرتی جغرافیہ کے اعتبار سے جبلِ نبو موآب کے بلند مرتفع کا ایک حصہ ہے، جہاں نسبتاً معتدل آب و ہوا، چونے کے پتھر سے تشکیل پانے والی پہاڑیاں، قدرتی چراگاہیں اور متعدد موسمی وادیاں موجود ہیں۔ اس بلند مقام سے بحرِ مردار، دریائے اردن، اریحا اور مغربی فلسطین کے وسیع علاقوں کا منظر نمایاں ہوتا ہے، اسی بنا پر قدیم دور میں اسے عسکری نگرانی اور سفری راستوں کی رہنمائی کے حوالے سے بھی اہم مقام حاصل تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسفار میں جبلِ نبو کی اہمیت محض اس حیثیت سے نہیں کہ یہ آپؑ کے سفر کا آخری مرحلہ تھا، بلکہ اس اعتبار سے بھی ہے کہ یہ مقام ایک نئے تاریخی دور کے آغاز کا ذریعہ بنا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کی نئی نسل کو منظم کیا، حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کو قیادت کی ذمہ داری سونپی، اللہ تعالیٰ کے احکام کی تجدید کی اور ارضِ مقدس کے قریب پہنچ کر اپنی نبوی ذمہ داریوں کی تکمیل فرمائی۔ بعد ازاں حضرت یوشع علیہ السلام نے بنی اسرائیل

کی قیادت سنبھالی اور دریائے اردن کو عبور کرکے اریحا اور پھر کنعان میں داخل ہوئے۔ اس طرح جبلِ نبو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوی جہد کے اختتام اور بنی اسرائیل کی آئندہ قومی و ریاستی تاریخ کے آغاز کے درمیان ایک اہم تاریخی رابطے کی حیثیت رکھتا ہے۔57

حوالہ جات

(1امیلی کوہرٹ، The Ancient Near East c. 3000–330 BC ، جلد اول) لندن :روٹلیج،1995 ء(، ص9–1 ۔

2)مارک وان ڈی میروپ، قدیم مشرقِ قریب کی تاریخ(3000–323 قبل مسیح)، چوتھا ایڈیشن(آکسفورڈ:وائلی بلیک ویل،2021ء)، ص1–7۔

3) شمس الدین ابو عبد اللہ محمد بن احمد المقدسی، أحسن التقاسیم في معرفة الأقالیم، تحقیق: محمد مخزوم (بیروت: دار صادر، 2003ء)، ص145–190۔

4) ولیم جی۔ ڈیور، The Lives of Ordinary People in Ancient Israel (گرینڈ ریپڈز: William B. Eerdmans Publishing Company،2012ء)، ص1–18۔

5)۔ امیلی کوہرٹ، The Ancient Near East c. 3000–330BC، جلد اول (لندن:1995، Routledgeء)، ص1–16، 21–32۔

6) کینتھ اے۔ کچن، On the Reliability of the Old Testament (گرینڈ ریپڈز: William B. Eerdmans Publishing Company، 2003ء)، ص257–312۔

7) ہیروڈوٹس، تواریخ (The Histories)، ترجمہ: Aubrey de Sélincourt (لندن:2003، Penguin Booksء)، کتاب دوم، باب5، ص115۔

8)۔ ابو جعفر محمد بن جریر الطبری، تاریخ الرسل والملوک، تحقیق: محمد ابو الفضل ابراہیم (قاہرہ: دار المعارف، 1967ء)، ج1، ص203–270۔

9)۔ ابن کثیر، اسماعیل بن عمر، البدایۃ والنہایۃ، ترجمہ: مولانا محمد جوناگڑھی، لاہور: مکتبہ قدوسیہ، ج1، "ذکر موسیٰ علیہ السلام مع فرعون"، ص284–291۔

10)۔ شمس الدین ابو عبد اللہ محمد بن احمد المقدسی، أحسن التقاسیم في معرفة الأقالیم، تحقیق: محمد مخزوم (بیروت: دار صادر، 2003ء)، ص137–145۔

11)۔ شہاب الدین یاقوت بن عبد اللہ الحموی، معجم البلدان، (بیروت: دار صادر، 1995ء)، جلد اول، ص347–350۔

12) ایان شا (مرتب)، قدیم مصر کی آکسفورڈ تاریخ (اصل: The Oxford History of Ancient Egypt)، آکسفورڈ: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 2000ء، ص289–336۔

13)۔ بیری جے۔ کیمپ، قدیم مصر: ایک تہذیب کی ساخت (اصل: Ancient Egypt: Anatomy of a Civilization)، دوسرا ایڈیشن، لندن: روٹلیج،2006ء، ص3–18، 85–112۔

14) ابن خرداذبہ، ابو القاسم عبید اللہ بن عبد اللہ، المسالک والممالک، بیروت: دار صادر، 1889ء، ص124–128۔

15) یاقوت بن عبد اللہ الحموی، معجم البلدان، بیروت: دار صادر، 1995ء، جلد 5، ص 143–145۔

16 ابن خرداذبہ، ابو القاسم عبید اللہ بن عبد اللہ، المسالک والممالک، بیروت: دار صادر، 1889ء، ص 124–128۔

17) شمس الدین ابو عبد اللہ محمد بن احمد المقدسی، أحسن التقاسیم في معرفة الأقالیم، تحقیق: محمد مخزوم، بیروت: دار صادر، 2003ء، ص 201–210۔

18) ابو الحسن علی بن حسین المسعودی، مروج الذهب ومعادن الجوهر، تحقیق: محمد محیی الدین عبد الحمید، بیروت: دار المعرفة، 1988ء، ج 1، ص 220–230۔

19) بیری جے۔ بیٹزل (Barry J. Beitzel)، دی نیو موڈی اٹلس آف دی بائبل (The New Moody Atlas of the Bible)، شکاگو: موڈی پبلشرز، 2009ء، ص 116–119۔

20) یاقوت الحموی، شہاب الدین عبد اللہ، معجم البلدان، بیروت: دار صادر، 1995ء، ج 5، ص 143–145۔

(21 ظٰہٰ 12 :

22) الطبری، محمد بن جریر، جامع البیان عن تأویل آي القرآن، ریاض: دار ہجر، 2001ء، ج 18، ص 520–525۔

23) جیمز کے۔ ہوفمائر (James K. Hoffmeier)، قدیم اسرائیل در سینا: بیابانی روایت کی صداقت کے شواہد (Ancient Israel in Sinai: The Evidence for the Authenticity of the Wilderness Tradition)، آکسفورڈ: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 2005ء، ص 125–150۔

24) محمد بن جریر الطبری، جامع البیان عن تأویل آي القرآن، تحقیق: عبد اللہ بن عبد المحسن الترکی، ریاض: دار ہجر، 2001ء، جلد 18، ص 525–530۔

25) بیری جے۔ بیٹزل (Barry J. Beitzel)، بائبل کا نیا موڈی اٹلس (The New Moody Atlas of the Bible)، شکاگو: موڈی پبلشرز، 2009ء، ص 120–123۔

26) جیمز کے۔ ہوفمائر (James K. Hoffmeier)، قدیم اسرائیل در سینا: بیابانی روایت کی صداقت کے شواہد (Ancient Israel in Sinai: The Evidence for the Authenticity of the Wilderness Tradition)، آکسفورڈ: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 2005ء، ص 35–60، 125–150۔

27) الشعراء: 63–66؛ یونس: 90–92؛ الدخان: 23–24

28) اسٹرابو (Strabo)، جغرافیہ (Geographica)، ترجمہ: ہوریس لیونارڈ جونز (H. L. Jones)، کیمبرج: ہارورڈ یونیورسٹی پریس، 1917–1932ء، جلد 16، ص 225–260۔

29) المقدسی، شمس الدین ابو عبد اللہ محمد بن احمد، أحسن التقاسیم في معرفة الأقالیم، تحقیق: محمد مخزوم، بیروت: دار إحیاء التراث العربي، 1987ء، ص 145–150۔

30) اسٹرابو (Strabo)، جغرافیہ (Geographica)، ترجمہ: ہوریس لیونارڈ جونز (H. L. Jones)، کیمبرج: ہارورڈ یونیورسٹی پریس، 1932ء، جلد 16، ص 225–260۔

31) ہیروڈوٹس (Herodotus)، تاریخ (The Histories)، ترجمہ: اوبری ڈی سیلنکورٹ (Aubrey de Sélincourt)، لندن: پینگوئن کلاسکس، 2003ء، کتاب دوم، ص 125–135۔

32) احمد بن علی المقریزی، المواعظ والاعتبار بذکر الخطط والآثار (الخطط المقریزیہ)، بیروت: دار صادر، جلد 1، ص 50–60۔

33) جیمز کے۔ ہوفمائر (James K. Hoffmeier)، قدیم اسرائیل در سینا: بیابانی روایت کی صداقت کے شواہد (Ancient Israel in Sinai: The Evidence for the Authenticity of the Wilderness Tradition)، آکسفورڈ: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 2005ء، ص 55–75۔

34) المائدہ: 26

35) یاقوت الحموی، معجم البلدان، بیروت: دار صادر، 1995ء، جلد 2، ص 67–70۔

36) ابو الحسن علی بن حسین المسعودی، مروج الذھب ومعادن الجوھر، بیروت: دار المعرفۃ، 1989ء، جلد 1، ص 220–225۔

37) جیمز کے۔ ہوفمائر (James K. Hoffmeier)، قدیم اسرائیل در سینا: بیابانی روایت کی صداقت کے شواہد (Ancient Israel in Sinai: The Evidence for the Authenticity of the Wilderness Tradition)، آکسفورڈ: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 2005ء، ص 170–205۔

کینتھ اے۔ کچن (Kenneth A. Kitchen)، عہدِ عتیق کی تاریخی صحت (On the Reliability of the Old Testament)، گرینڈ ریپڈز، مشی گن: ولیم بی۔ ایرڈمنز پبلشنگ کمپنی، 2003ء، ص 241–270۔

بیری جے۔ بیٹزل (Barry J. Beitzel)، بائبل کا نیا موڈی اٹلس (The New Moody Atlas of the Bible)، شکاگو: موڈی پبلشرز، 2009ء، ص 55–70۔

38) المائدہ: 20–26؛ الاعراف: 136–137

39) بیری جے۔ بیٹزل (Barry J. Beitzel)، بائبل کا نیا موڈی اٹلس (The New Moody Atlas of the Bible)، شکاگو: موڈی پبلشرز، 2009ء، ص 65–75۔

40) یاقوت الحموی، معجم البلدان، بیروت: دار صادر، 1995ء، جلد 3، ص 285–290۔

بیری جے۔ بیٹزل (Barry J. Beitzel)، بائبل کا نیا موڈی اٹلس (The New Moody Atlas of the Bible)، شکاگو: موڈی پبلشرز، 2009ء، ص 65–75۔

41) زِیف مِسِل (Ze'ev Meshel)، قادش برنیع: قدیم قلعہ اور صحرائی مرکز (Kadesh-Barnea: A Fortress and Desert Oasis)، تل ابیب: تل ابیب یونیورسٹی، 1981ء، ص 10–35۔

42) جیمز کے۔ ہوفمائر (James K. Hoffmeier)، قدیم اسرائیل در سینا: بیابانی روایت کی صداقت کے شواہد (Ancient Israel in Sinai: The Evidence for the Authenticity of the Wilderness Tradition)، آکسفورڈ: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 2005ء، ص 200–230۔

کینتھ اے۔ کچن (Kenneth A. Kitchen)، عہدِ عتیق کی تاریخی صحت (On the Reliability of the Old Testament)، گرینڈ ریپڈز، مشی گن: ولیم بی۔ ایرڈمنز پبلشنگ کمپنی، 2003ء، ص 241–270۔

43) ابن کثیر، اسماعیل بن عمر، قصص الأنبیاء، تحقیق: عبد الحی الفرماوی، قاہرہ: دار الطباعۃ والنشر الإسلامیۃ، 1997ء، ص 250–260۔

44) یاقوت الحموی، شہاب الدین، معجم البلدان، بیروت: دار صادر، 1995ء، جلد 1، ص 164–166 (مادہ: آدوم)۔

45) سٹرابو (Strabo)، جغرافیہ (Geographica)، ترجمہ: Horace Leonard Jones، لندن: William Heinemann، 1917ء، جلد 16، ص 264–270۔

فلاویس جوزیفس (Flavius Josephus)، یہودی آثار (Antiquities of the Jews)، ترجمہ: William Whiston، گرینڈ ریپڈز: Kregel Publications، 1987ء، کتاب 4، باب 4، ص 100–105۔

46) یاقوت الحموی، شہاب الدین، معجم البلدان، بیروت: دار صادر، 1995ء، جلد 1، ص 164–166 (مادہ: اَدوم)۔

المقدسی، شمس الدین، أحسن التقاسیم في معرفة الأقالیم، تحقیق: محمد مخزوم، بیروت: دار إحیاء التراث العربي، 1987ء، ص 170–175۔

47) Nelson Glueck، Explorations in Eastern Palestine، نیو ہیون: American Schools of Oriental Research، 1935ء، جلد 1، ص 40–70۔

48) جیمز کے۔ ہوفمائر (James K. Hoffmeier)، قدیم اسرائیل در سینا: بیابانی روایت کی صداقت کے شواہد (Ancient Israel in Sinai: The Evidence for the Authenticity of the Wilderness Tradition)، آکسفورڈ: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 2005ء، ص 245–260۔

کینتھ اے۔ کچن (Kenneth A. Kitchen)، عہد نامہ قدیم کی صداقت پر تحقیق (On the Reliability of the Old Testament)، گرینڈ ریپڈز: ولیم بی۔ ایرڈمنز پبلشنگ، 2003ء، ص 257–270۔

49) بیری جے۔ بیٹزل (Barry J. Beitzel)، بائبل کا نیا موڈی اٹلس (The New Moody Atlas of the Bible)، شکاگو: Moody Publishers، 2009ء، ص 80–90۔

امیحائی مزار (Amihai Mazar)، آثارِ قدیمہ اور سرزمینِ بائبل (Archaeology of the Land of the Bible: 10,000–586 BCE)، نیویارک: Doubleday، 1990ء، ص 459–470۔

50) یاقوت الحموی، شہاب الدین، معجم البلدان، بیروت: دار صادر، 1995ء، جلد 5، ص 219–221 (مادہ: مؤاب / موآب)۔

51) Strabo، Geographica، ترجمہ: Horace Leonard Jones، Loeb Classical Library، کیمبرج: Harvard University Press، 1932ء، جلد 7 (Book XVI)، ص 298–315۔

Josephus، The Antiquities of the Jews، ترجمہ: H. St. J. Thackeray، Loeb Classical Library، کیمبرج: Harvard University Press، 1930ء، جلد 4، کتاب 4، ص 295–335۔

52) یاقوت الحموی، شہاب الدین، معجم البلدان، بیروت: دار صادر، 1995ء، جلد 5، ص 219–221 (مادہ: مؤاب)، نیز جلد 1، ص 191–194 (مادہ: الأردن)۔

المقدسی، شمس الدین، أحسن التقاسیم في معرفة الأقالیم، تحقیق: محمد مخزوم، بیروت: دار إحیاء التراث العربي، 1987ء، ص 154–164، 174–181۔

ابو الفداء، عماد الدین اسماعیل بن علی، تقویم البلدان، بیروت: دار صادر، 1840ء (افسٹ ایڈیشن)، ص 236–241۔

53) ہوفمائر، جیمز کے۔، قدیم اسرائیل در سینا: بیابانی روایت کی تاریخی صداقت کے شواہد (Ancient Israel in Sinai: The Evidence for the Authenticity of the Wilderness Tradition)، آکسفورڈ: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 2005ء، ص155–175، 181–195۔

بیٹزل، بیری جے۔، بائبل کا نیا موڈی اٹلس (The New Moody Atlas of the Bible)، شکاگو: موڈی پبلشرز، 2009ء، ص98–105۔

کچن، کینتھ اے۔، عہدِ قدیم کی تاریخی وثوق پذیری (On the Reliability of the Old Testament)، گرینڈ ریپڈز، مشی گن: ولیم بی۔ ایرڈمینز پبلشنگ کمپنی، 2003ء، ص188–194، 262–266۔

54) لیمیر، آندرے، "میشع کتبہ (موآبی پتھر)"، ضمن: The Context of Scripture، جلد 2، مدیر: ولیم ڈبلیو۔ ہیلو، لیڈن: برِل، 2000ء، ص137–138۔

55) آہرونی، یوحنان، سرزمینِ بائبل کا تاریخی جغرافیہ (The Land of the Bible: A Historical Geography)، فلاڈیلفیا: Westminster Press، 1979ء، ص289–295۔

56) اسٹرابو، جغرافیہ (Geographica)، ترجمہ: Horace Leonard Jones، کیمبرج: Harvard University Press، 1932ء، کتاب 16، ص 298–315۔

57) یاقوت الحموی، شہاب الدین، معجم البلدان، بیروت: دار صادر، 1995ء، جلد 2، ص145–147 (مادہ: الأردن)۔